

اسباب عروج و زوال امت

(۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی | لیکن افسوس ہے کہ اسلام کا عظیم الشان دور زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا۔ اور رہتا بھی کس طرح؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زبان حق ترجمان سے فرما چکے تھے۔

خَيْرَ أُمَّةٍ قَرِنِي لَتَمَّ الْاَذِينَ يَلُوْهُمْ ثُمَّ لَا يَنْتَحِدُوْنَ وَلَا يَنْتَهَدُوْنَ وَلَا يُؤْتَمِنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمِنُوْنَ وَلَا يَصْنَعُوْنَ وَلَا يَصْنَعُوْنَ
میری امت میں سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر اس کے بعد والوں کا، اور پھر اس کے بعد والوں کا، پھر تمہارے بعد قوم آگے جو شہادت دیگی حالانکہ اس سے شہادت طلب نہ کی جاوے گی۔ یہ لوگ خائن ہونگے امانت دار نہیں یہ نذریں مانینگے مگر انھیں پورا نہیں کریں گے۔ اور ان میں مڑنا پنا عام ہو جائیگا۔ (صحیح بخاری)

اس پیشین گوئی میں یہ بات لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے تین ادوار کو خیر فرمایا ہے لیکن خیر ہونے میں تینوں برابر کے درجہ کے نہیں۔ کیونکہ عربی زبان میں کلمہ ثَمَّ جس طرح تراخی زبانی پر دلالت کرتا ہے اسی طرح اس سے تراخی فی المرتبہ کا مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کا بہترین دور نودہ ہوگا جس میں آنحضرت جلوہ فرمائے عالم آب و گل ہوں گے۔ اس کے بعد دو تابعین بھی خیر القرون ہوگا۔ مگر عہد صحابہ سے کم درجہ پر بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حدیث میں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ عہد صحابہ میں اسلامی روح کا اضحلال شروع ہو جائیگا۔ تابعین کے دور

میں یہ اضمحلال اور بڑھیکا۔ لیکن ان دونوں زمانوں کا اضمحلال غیر محسوس ہوگا۔ اس لئے بحیثیت مجموعی آئندہ آئے والے زمانوں کی بہ نسبت یہ دور بھر بھی خیر القرون ہوں گے۔ تنزیلاً میں سمجھئے کہ کسی چیز میں سپیدی کامل درجہ کی ہوتی ہے تو اس میں سیاہی کا بالکل نام و نشان نہیں ہوتا۔ لیکن جب سپیدی گھٹنے لگتی ہے تو جس رفتار سے وہ کم ہوتی جاتی ہے اسی رفتار سے سپیدی کی ضد یعنی سیاہی بڑھتی رہتی ہے۔ اول اول یہ غیر محسوس ہوتی ہے لیکن آخر کار ایک وقت آتا ہے جب سیاہی اس تمام چیز پر محیط ہو جاتی ہے اور اب کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ یہ کبھی سپید بھی تھی۔ یا مثلاً عالم شباب گزرنے کے بعد قویٰ میں ضعف و انحطاط پیدا ہونے لگتا ہے تو شروع میں اس درجہ غیر محسوس ہوتا ہے کہ کسی حادثہ طیب کے سوا کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ پھر جب عہد شباب کا آفتاب لب بام کرے مطلع حیات پر شام پیری کی تاریکیاں بکھر دیتا ہے اور کائنات عالم کی ہر چیز اس و غلین نظر آنے لگتی ہے تو انسان کو اپنے قویٰ کا انحطاط بین طور پر محسوس ہوتا ہے اور اب اسے تلافی مافات کی فکر ہوتی ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ ہو ہو پوری ہو کر رہی۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ہر صحابی اپنی انفرادی زندگی میں ایمان و عمل کے آسمان کا آفتاب و ماہ تاب، اور فرمان نبویؐ ان میں سے تم جس کی کا بھی اقتدار کرے گے ہدایت پاؤ گے، کامصداق تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسلام کا وہ عظیم المثل اجتماعی نظام جو عہد نبوت اور اس کے بعد خلفائے ثلاثہ کے زمانوں میں قائم تھا حضرت عثمانؓ کے واقعہ شہادت ۳۵ء کے بعد اپنی اسی شکل و صورت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکا۔ خیر کے ساتھ شر لگا ہوتا ہی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی متعدد دفعے اٹھے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں نے اپنی غیر معمولی فراست دینی، شجاعت اور جرأت سے ان کا استیصال اس طرح کر دیا کہ ان کو کچھ اُٹھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ لیکن حضرت عثمانؓ کا واقعہ شہادت اسلام کی تاریخ کا ایسا المناک حادثہ فاجعہ ہے جس نے رونما ہو کر مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں لامرکزیت پیدا کر دی۔ اور ایک ایسے فتنہ عظیم کا دروازہ کھول دیا جس کی نحوستیں مرور

ایام کے ساتھ برصغیر ہی رہیں، خلیفہ سوم حضرت ذوالنورین کے شہید مظلوم ہونے میں کس بد بخت کو کلام ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر عثمانی حلم و مسامحت کی جگہ دبّہ فاروقی کا رفرما ہوتا تو صورتِ حال بالکل ہی دیگر گوں ہوتی۔ پھر نہ عبداللہ بن سبا ایسے منافق کی ریشہ دوایاں کا مباب ہو سکتی تھیں اور نہ مصر و عراق کے بد باطن انسانوں کو خلافت کے برخلاف علم بغاوت بلند کرنے کی گت خنی کا حوصلہ ہو سکتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے جان دیدی مگر فتنہ کے کھڑا ہونے کے اندیشہ سے کسی کو باغیوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ بہر حال جو کارکنان قضا و قدر کا فیصلہ ہو چکا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔ خلیفہ سوم انتہائی بیدری اور سفاکی کے ساتھ شہید کر دیے گئے۔ دودن تک نعلین مبارک بے گور و کفن پڑی رہی۔ خون شہادت میں نہکا ہوئے جسم مطہر کو غسل دینے کی کیا ضرورت تھی تیسرے دن چند آدمیوں نے جان سٹھپی پر رکھ کر دفن کا انتظام کیا۔ حضرت علیؓ کا عبداللہ بن سبا اس غیر معمولی ایشار کے باوجود ان کو جو اندیشہ تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ اور اسلام کی جماعتی نظام میں لامرکزیت پیدا ہو گئی۔ آپ کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ منتخب کئے گئے آپ کی بے نفسی اور بے غرضی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ نے شروع میں خلافت کا بار نہ بھانسنے سے بہت انکار کیا اور فرماتے رہے کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ لیکن جب مدینہ کے اکابر صحابہ نے اس کے لئے پیہم اصرار کیا تو آپ نے جہور کی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے اس کو منظور فرمایا۔ حضرت علیؓ کی جلالتِ شان، تقویٰ، دیانت اور خلوص و ولایت میں چون و چرا کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ منافقین کی وسیع کاریوں اور بعض نئے مسلمانوں کی ناواقفیت کی بنا پر عراق اور شام میں جو اندرونی کشمکش پیدا ہو گئی تھی وہ نہایت نازک صورت اختیار کر چکی تھی اور اس کو فرو کرنے کے لئے جس غیر معمولی سیاسی تدبیر اور حزم و دورانِ اندیشی کی ضرورت تھی، حضرت علیؓ کی پاک نفسی، نیک باطنی، اور اخلاقی عظمت و برتری اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ امیر معاویہ کو جو شام کے گورنر تھے اور وہاں اپنا بڑا رسوخ و اثر رکھتے تھے، معزول کرنے کا ارادہ کر لیا، مدینہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ اور

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایسے جلیل القدر اور ریاست داں صحابہ تشریف رکھتے تھے انہوں نے حضرت علیؓ کو سمجھایا کہ اگر آپ امیر معاویہ کو شام کی گورنری سے الگ کرنا چاہتے ہیں تو پہلے ان سے اپنی خلافت پر بیعت لے لیجئے۔ اغلب یہ ہے کہ وہ اس میں آپ سے مخالفت نہیں کریں گے پھر آپ ان کو معزول کر سکتے ہیں ورنہ اگر آپ نے بیعت لینے سے پہلے ہی ان کو ولایت شام سے الگ کر دیا تو وہ حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانہ سے آپ کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیں گے اور امت میں تشتت پیدا ہو جائیگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مغیرہ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں بزرگوں کی یہ رائے نہایت صائب اور درست تھی مگر نوشتر تقدیر پر کس کی مجال ہے کہ خط نسخ پھیر کے حضرت علیؓ نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار فرما دیا اور صرف امیر معاویہ ہی نہیں بلکہ اور دوسرے حضرات جو حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے مختلف جگہوں کے گورنر بن چکے آپ سے تھے ان سب کے نام عزل کا پروانہ بھیج دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف امیر معاویہ کے غیر معمولی اثر و اقتدار کے باعث پورا ملک شام حضرت علیؓ کا ساتھی بن سکا بلکہ جب حضرت معاویہؓ نے خلیفہ مظلوم عثمانؓ غنیؓ کے خون آلود کرتہ کا اور باغیوں کی تلوار سے حضرت نائلہ کی تین کٹی ہوئی انگلیوں کا مظاہرہ جامع دمشق میں کر کے اہل شام کو حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے کی دعوت دی، تو لوگوں کا حاشا یہ تھا کہ زار و قطار روتے تھے اور خلیفہ شہید کے خون کا بدلہ لینے کیلئے عہد و پیمان کرتے تھے۔

اور دوسری طرف مصر سے قیس بن سعد کو الگ کر کے جو نہایت مدبر و دراندیش اور خود حضرت علیؓ کے سچے خیر خواہ تھے اور ان کی جگہ عمر بن ابی بکرؓ کو جو باغیوں کے ساتھ ملکر حضرت عثمانؓ کی شان میں ایک نہایت دردناک گستاخی کر چکے تھے مصر کا والی بنا کر مصر کی فضا کو بھی اپنا مخالف کر لیا۔ اس پر مزید طرہ یہ ہوا کہ یہ خیال فرما کر کہ حرم نبویؐ کو شر و فتن سے محفوظ رکھنا چاہئے آپ نے دار الخلافہ مدینہ سے کوفہ میں منتقل کر دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت علیؓ اکابر صحابہ سے دور ہو گئے اور وہاں عجم کے نو مسلم آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان عجمی نو مسلموں میں ظاہر ہے ایسے لوگ بھی تھے جن کے دلوں میں اسلام کی حقیقی

روح نے پورے طور پر گھبر نہیں کیا تھا اور وہ ذرا سی باتوں کی آڑ لیکر جنگ کا ہنگامہ برپا کرنے کی فکر میں لگ رہے تھے۔ حضرت علیؑ نے جو کچھ کیا اس کے لئے سب سے بڑا عذر یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ جیسے پاک باطن بے نفس اور متدین تھے ایسا ہی دوسروں کو سمجھتے تھے اور ان سے توقع رکھتے تھے کہ وہ لوگ اپنی ذاتی منفعتوں سے صرف نظر کر کے دربار خلافت کے احکام کو بے چون و چرا بجالائیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؑ کا یگانہ ذاتی طور پر ان کے فضائل آبِ ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ تدبیر سیاسی میں ایسے بہت سے مراحل آتے ہیں جبکہ یہ حسنِ ظن مضرت ثابت ہو سکتا ہے۔

پھر اگر اس حسنِ ظن کے ساتھ حضرت عمرؓ کا سادہ بدبہ بھی ہوتا تو بات کچھ زیادہ نہ بگڑتی۔ حضرت علیؓ بھجر اپنے احکام کی تعمیل کر سکتے تھے اور اگر کوئی فتنہ کھڑا ہوتا تو اس کی روک تھام پوری قوت سے کامیابی کے ساتھ کر سکتے تھے، مگر افسوس ہے کہ یہاں صورتِ حال یہ بھی نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ نے خالد بن ولیدؓ جیسے ہر دلعزیز اسلامی جرنیل کو معزول کیا تو کسی کو اس کے خلاف دم مارنے کی مجال نہیں ہوئی۔ اسی طرح حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور فاتح قادسیہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو کوفہ کی گورنری سے الگ کیا گیا تو کسی کو اس کی مخالفت کرنے کی جرات نہ ہو سکی۔ لیکن حضرت علیؓ نے امیر معاویہ کے نام شام کی گورنری سے معزول ہونے کا پروانہ بھیجا تو تمام اہل شام میں آگ سی لگ گئی اور حضرت علیؓ کے خلاف مخالفت کا ایک شدید طوفان امنڈ پڑا۔

حضرت علیؓ کی مخالفت | اس تمام مخالفت کی بنیاد صرف اس بات پر قائم تھی کہ حضرت علیؓ قاتلین حضرت عثمانؓ سے قصاص لینے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ کیوں کامیاب نہیں ہو سکے؟ یہاں اس کے ذکر کرنے کا موقع نہیں ہے مگر واقعہ یہی ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی امیر کی سیاسی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں اور اس کے احکام کو بے تامل بجالائیں۔ عراق کے جو لوگ حضرت علیؓ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی سچے دل سے حضرت علیؓ کے سامنے اور ان کے مددگار نہیں تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں اپنی جماعت کو

خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

”میں جب قم سے موسم سرما میں کہتا ہوں کہ شام والوں سے جنگ کرو تو تم کہتے ہو یہ تو برا سخت موسم ہے، کڑا کے کا جائزہ پڑھا ہے مگر جب موسم گرما میں کہتا ہوں کہ اچھا اب ان لوگوں سے لڑو تو تم کہنے لگتے ہو کہ آج کل تو بڑی ہی سخت گرمی ہو رہی ہے گرم ہواؤں کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ کو سیاست ہی نہیں آتی۔ ہاں ٹھیک ہے جس شخص کی اطاعت نہیں کی جاتی اس کو سیاست بھی نہیں آتی۔“

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت حالات کس قدر پیچیدہ ہو چکے تھے۔ ایک طرف شام، مصر اور حجاز کے لوگ تھے جن کی اکثریت کھلم کھلا حضرت علیؑ کی مخالفت پر کمر بستہ تھی اور دوسری جانب جو جماعت حضرت علیؑ کی حامی تھی اس میں بھی آپ کی حمایت و اعانت کا پورا جوش اور ولولہ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ آپ خلیفہ منتخب ہو چکے تھے اور آپ کا یہ انتخاب بالکل حق بجانب اور درست تھا۔ اس بنا پر آپ کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں تھا کہ جو لوگ دربار خلافت کے احکام کی تعمیل نہ کریں ان کو سزا دی جائے۔ حضرت علیؑ کے سیاسی تدبیریں کسی کو کلام ہو تو ہو لیکن ان کی بہادری میں کسی کو کیا مجال گفتگو ہو سکتی ہے؟ آخر کار اس کشمکش کا نتیجہ جنگ جمل و صفین کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور اسلام کے وہ بہادر سپاہی جنہوں نے دوش بدوش کھڑے ہو کر بدر و حنین کے معرکوں میں کفر و شرک کی طاغوتی قوتوں کو شکست فاش دی تھی اب وہ خود آپس میں ایک دوسرے کے خلاف تیغ آزمائی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

تغویر تو اسے جبرخ گرداں تغوی

امیر معاویہ کا طرزِ عمل | لیکن یہ جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار صرف حضرت علیؑ کی ذات کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ امیر معاویہ مشہور مدبر اور صاحب سیاست بزرگ تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اسلام کی بڑی شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ انہوں نے ہی طرابلس الشام کو فتح کیا۔ اس کے علاوہ شام کے تمام سرحدی علاقوں پر قبضہ حاصل کر کے شام کو رومیوں کی دستبرد سے محفوظ بنایا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان سے اجازت لیکر ایک

بحری بیڑا تیار کیا اور بحرِ روم کے مشہور جزیرہ قبرص (سائپرس) کو فتح کیا۔ یہ بحری بیڑہ اتنا طاقتور اور مضبوط تھا کہ اس کے باعث مسلمان رومیوں کے بحری حملہ سے مامون ہو گئے۔ ان فتوحات کے علاوہ وہ چونکہ انتہا درجہ کے بہادر و غرور اور ہوشیار تھے اسلئے تمام اندرونی اور بیرونی شورشوں اور سازشوں سے باخبر رہتے تھے۔ اس بنا پر انھوں نے بہت سی سازشوں کو ظاہر ہونے سے پہلے ہی ناکام کر دیا۔ ان تمام فضائل کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت علیؑ کے مقابلہ میں ان کی خلافت کو ناکام کرنے کیلئے انھوں نے جو کچھ کیا وہ کم از کم ان جیسی بزرگ شخصیت سے متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر ان میں حضرت عثمانؓ کے قصاص لیئے کا ایسا ہی جذبہ تھا تو وہ یہ کام حضرت علیؑ کے ہاتھوں پر خلافت کی بیعت کر کے بھی انجام دے سکتے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اکابر صحابہ کی جانیں ضائع ہوئیں۔ امت میں تفرقہ پیدا ہو گئے۔ اسلام کا اجتماعی نظام درہم و برہم ہو کر رہ گیا، مگر حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ تو پھر بھی نہ لیا جاسکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انتخابِ خلیفہ کے معاملہ میں مہاجرین و انصاریں جو شدید اختلاف پیدا ہوا تھا۔ اور اس وقت حضرت عمرؓ نے موقع کی نزاکت کو محسوس فرما کر حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے جس طرح اس قضیہ نامرضیہ کو ختم کر دیا تھا۔ اگر اس وقت حضرت معاویہؓ بھی ایسا ہی طرزِ عمل اختیار کرتے تو بے شبہ امتِ مرحومہ ایک عظیم فتنہ سے بچ جاتی اور وہ رخسہ پیدا نہ ہوتے جو اب پیدا ہوئے، حضرت علیؑ کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کا اپنی خلافت پر اصرار کرنا ایک ایسی بات ہے جس کو اسلام کی کوئی قابلِ قدر خدمت نہیں کہا جاسکتا۔

تحکیم کا معاملہ [چنانچہ اس کا ثبوت واقعہ تحکیم سے بھی ملتا ہے تحکیم کی پیش کش امیر معاویہ کی ہی طرف سے ہوئی تھی جب انھوں نے پچھا کہ لیلۃ الحزین کی جنگ میں حضرت علیؑ کو کامیابی ہو چکی ہے تو ان کے بعض ساتھیوں نے آمادہ کیا کہ وہ حضرت علیؑ کے سامنے یہ تجویز پیش کریں کہ خود ان کی اور حضرت علیؑ کی طرف سے ایک ایک نمائندہ منتخب کیا جائے اور پھر یہ دونوں نمائندے جو فیصلہ کر دیں ان کی پابندی

سختی کے ساتھ کی جائے۔ ان شیراز کار نے یہ بھی کہا کہ حضرت علیؑ اس تجویز کو قبول کریں یا رد فرمائیں بہر حال ہمارا فائدہ ہوگا۔ ان الفاظ سے خود معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تحکیم کی تجویز کو پیش کر رہے تھے، ان کی نیتوں میں خلوص نہیں تھا اور وہ وقتی طور پر اس بہانہ اپنا کام نکالنا چاہتے تھے۔ حضرت علیؑ نے اس تجویز کو قبول فرمایا۔ اور اس میں شک نہیں کہ سیاسی اعتبار سے حضرت علیؑ کا اس تجویز کو قبول فرمالینا کوئی کمزوری نہ ہو تو ہو لیکن حضرت علیؑ کی صافدلی، پاک نہادی اور نیک طبیعتی کی ایک بین اور روشن دلیل ہے۔ جو اقدام کسی غرض اور ذاتی منفعت کے پیش نظر کیا گیا ہو۔ اس میں اجتماعی خیر و برکت کی توقع کس حد تک ہو سکتی ہے؟ نتیجہ اس کا بھی اسلام کے حتیٰ میں نہایت خطرناک نکلا۔ جس کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ اب تک مسلمانوں میں حضرت علیؑ اور حضرت معاویہؓ کے حامیوں کی دو جماعتیں تو تھیں ہی اب خوارج کے نام سے ایک اور فرقہ پیدا ہو گیا جو دونوں کا شدید مخالف اور دشمن تھا۔ اس فرقہ کے عناصر پہلے سے موجود تھے۔ لیکن ان کو ابھرنے اور منظم ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اب ان سب نے ایک مرکز پر جمع ہو کر ایک مستقل اور نہایت خطرناک محاذ قائم کر لیا۔ نہروان کا مقام اس فرقہ کی کوششوں کا خاص آماجگاہ تھا۔ حضرت علیؑ نے خطرہ کا احساس کر کے اس فرقہ طاغیہ سے قتال کیا اور شکست فاش دیکر اس کے کس بل نکال دیے۔

خوارج کی منظم کوششیں پریشان ہو چکی تھیں اب ان کے کچھ کچھ لوگوں نے حضرت علیؑ، حضرت معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ تینوں کو قتل کر دینے کی ایک کل سازش کی۔ عمرو بن العاصؓ حسان اتفاق سے بچ نکلے امیر معاویہؓ زخمی ہوئے مگر علاج معالجہ کے بعد اچھے ہو گئے۔ اب رہے امیر المومنین حضرت علیؑ وہ دغا خیزوں کے ہاتھوں ایسے شدید زخمی ہوئے کہ جان بزنہ ہو سکے۔ اور آخر کار علم و عمل کا یہ سرسبز منیر اور خلافت راشدہ کا آخری کوکب رخشاں رمضان سنہ ۴۰ میں اس عالم خاک و باد کو الوداع کہہ گیا۔

حضرت علیؑ کے عہد خلافت پر تبصرہ | حضرت علیؑ کا عہد حکومت کچھ زیادہ طویل نہیں ہے۔ اگر اس پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات باسانی معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کا طرز حکومت خلافت راشدہ کے منہاج پر تھا، ان کا انتخاب

خود ان کی خواہش کے بغیر ہوا۔ اور ان مہاجرین و انصار نے انتخاب کیا جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا انتخاب کیا تھا۔ پھر آپ کا عام رویہ صلح جو یا نہ تھا، کسی کے ساتھ غیر شرعی جبر و تشدد کا معاملہ نہیں کیا۔ اگرچہ اس وقت بعض منافقوں کی کوششوں سے حالات اس قدر پیچیدہ ہو گئے تھے کہ آپ ان کے سلجھانے میں باحسب جود کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن آپ کے طرز حکومت میں ملکیت کا ذرہ برابر شائبہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی اسی تقویٰ طہارت اور سادگی و بے نفسی کے ساتھ گزاری جو ان کے میسر و خلفاء کا شعارِ خصوصی تھا یہاں تک کہ وفات کے وقت آپ کے بعد حضرت حسنؓ کے انتخاب کے متعلق آپ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے ثبات و نفی میں کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ ارباب رائے پر ہی اس معاملہ کو چھوڑ دیا، آپ کے عہد حکومت میں ڈھونڈھ سے بھی کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ آپ نے کسی موقع پر بھی ”ڈپلومیٹک پالیسی“ سے کام لیا ہو۔ آپ کا ظاہر و باطن ایک تھا جو دل میں ہوتا تھا، زبان سے اسی کا اظہار فرماتے تھے۔ اور جو زبان سے کہتے تھے وہی دل میں ہوتا تھا۔ آپ نے منصبِ خلافت سے اپنی ذات کیلئے یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے لئے کوئی ناجائز منفعت کبھی حاصل نہیں کی۔ آپ پر خبیثتِ ربانی اور خوفِ خدا کا پورا غلبہ تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر کوئی شک نہیں کہ آپ کی خلافت خلافتِ راشدہ اور اسلام کے آئینِ طرز حکومت کی حامل تھی۔

دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں ایک یہ کہ خلیفہ وقت خود کن اخلاق و صفات کا حامل ہے اور وہ اپنی حکومت کو کس نظام کے ماتحت چلانا چاہتا ہے اور دوسری یہ کہ اس کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی؟ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس بارہ میں حضرت علیؓ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ کا عہد خلافت اس اعتبار سے ناکام ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اسلام کے جمہوری نظام کو چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے، اس ناکامی کے وجوہ و اسباب مختصرًا حسب ذیل ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی ناکامی کے اسباب | (۱) مجھ کو صاف لفظوں میں کہنا چاہئے کہ ان اسباب میں سب سے بڑی وجہ قبائلی اور خاندانی عصبیت کا ظہور ہے۔ یہ کوئی دھکی چپی حقیقت نہیں ہے کہ یہ

عصبیت جاہلیہ ہی ایک ایسا زہر ہے جو کسی قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر کے اس کی تمام اخلاقی اور علمی قوتوں کو کمزور یا ان کو حد سے زیادہ غیر معتدل بنا دیتا ہے۔ جب یہ زہر تدریجی طور پر ترقی کرتے کرتے کسی قوم کے دل اور دماغ پر پوری طرح مسلط ہو جاتا ہے تو اس قوم پر ایک ایسی جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ انسانیت، جمہوریت، اور عام رواداری کے تمام مقصدیات کو پس پشت ڈال کر وحشیانہ اعمال و افعال میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی، اس میں اپنی برتری اور تفوق کا احساس اس درجہ قوی ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس جذبہ پہنائی کی تسکین کے لئے جائز اور ناجائز کا فرق بھی ملحوظ نہیں رکھتی، اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ کوئی بین الاقوامی اجتماعی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس عصبیت کو خیر بنیاد سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے اور خاندانی و قبائلی برتری کے احساس کی جگہ عام مساوات و اخوت انسانی کا اذعان و یقین کامل طور پر پیدا نہ کر دیا جائے۔

اسلام میں عصبیت جاہلیت | عرب کا ملک اس زہر سے سب سے زیادہ مسموم تھا۔ اس بنا پر یہاں آئے دن قتل کی شدید مذمت

خونریزی کا ہنگامہ گرم رہتا تھا یہ لوگ غیر عربی قوموں کے ساتھ تو کسی وفاقی نظام کے ماتحت یکجا نہیں ہوتے۔ خود آپس میں ایک دوسرے کے تعاون و اشتراک سے کوئی قابل ذکر عرب اسٹیٹ قائم نہیں کر سکتے تھے پھر جب اسلام آیا تو عقیدہ توحید کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ یہ لوگ جاہلانہ تعصبات و حمیات سے الگ ہو کر ایک مرکز پر جمع ہو گئے، اور جو پہلے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اب شہ و لشکر ہو کر زندگی بسر کرنے لگے عصبیت جاہلیہ کی شرانگیزی اور حسدیت کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا تو چونکہ دنیا کو آپ اپنا ایک آخری پیغام دے رہے تھے اسلئے ظاہر ہے آپ بہت ہی اہم اور ضروری باتوں کا ذکر فرما سکتے تھے۔ آپ نے اس خطبہ میں جہاں دین کے اور بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی۔ ان کے ساتھ ہی مسلمانوں کو عصبیت جاہلیت سے بچ رہنے کی تلقین و تاکید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فَإِنَّ دَمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ
عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَمَا أَنَّ دَمَكُمْ هَذَا -
پس تمہیں تمہارے خون، مال اور آبرؤں تم پر ایسی ہی واجب
احکمت ہیں جیسا کہ آج کا دن لائقِ حرمت ہے۔
اس کے بعد ارشاد ہوا۔

وَسَلَقُونَ رَبَّكُمْ فَيَسْأَلُكُمْ عَنْ أَعْمَالِكُمْ
الْأَفْلا تَرْجِعُونَ بَعْدَى ضَلَالٍ لَا يَضُرُّ
بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ -
اور تم عنقریب اپنے ربؐ کے لوگے تو وہ تم سے تمہارے
اعمال کی نسبت دریافت کرے گا۔ خبردار ہو کہ میرے
بعد تم گمراہ مت ہو جانا کہ تم آپس میں ایک دوسرے
(بخاری باب حجة الوداع) کی گردن مارنے لگو۔

صحیحین کی ہی ایک اور روایت میں اس سے بھی زیادہ صریح الفاظ ہیں۔
الْأَكْلُ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ
قَدْحِي مَوْضُوعٌ -
یاد رکھو جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں
کے نیچے رکھے ہوئے ہیں۔

نسب و حسب کے رنگ و روپ کے اور دولت و غربت کے جتنے امتیازات تھے اور جو ہمیشہ دنیا میں شرف
ماوربے چینی و بدامنی کا سبب بنے ہیں ان سب کو یکقلتم تم کر دینے کا حتمی اور قطعی اعلان فرما دیا گیا۔ ترمذی میں
لَا انْخَفَظَتْ صُلَى اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا تھا۔

إِنَّ اللَّهَ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبْيَةَ الْجَاهِلِيَّةِ
وَفَضَّلَ الْآبَاءَ أَوْفَافًا هُوَ مَوْجِدٌ تَقَى
وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ النَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُو آدَمَ
وَأَدَمُ خَلْقٌ مِنْ تَرَابٍ -
بے شبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا حصہ اور آباؤ
احبار پر فخر کرنے کی عادت کو دور کر دیا ہے، اب بنائیں
صرف دو ہی قسم کے آدمی ہونگے ایک پر نیر کا رومن دوسرے
بد نصیب کا کافر، تمام انسان آدم کے بیٹے ہیں اور آدم
مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصاریں جو مواخات کر لائی تھی وہ بھی

اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کی نسبت جو ارشاد فرمایا تھا۔
سلمانٌ من اهل البيت۔ سلمان تو ہمارے ہی گھر کا ایک فرد ہے۔

تو اس سے بھی غرض یہ تھی کہ مسلمان عربیت اور عجبت کے امتیاز کو بالکل فراموش کر دیں یہی وجہ ہے کہ چونکہ عصیت جاہلیت انسانوں کے اجتماعی نظام کی تکمیل کی راہ کا سب سے بڑا سنگِ گراں ہے اس لئے جب اسلام نے اس سنگِ گراں کو دور کر کے عام اخوت اور مساوات کا جذبہ پیدا کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کے حق میں اپنی ایک رحمتِ خاص بنا کر اس کا احسان جتنا چاہنا چاہے ارشاد ہے۔

وَاذْكُرْ اَنَّمَا اَنعَمَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلْفَظَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاصْبَحْتُمْ بِنِعْمَةِ اٰخِوَانًا۔
اور تم خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کے لطف و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔

پھر اس کام کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ محمد! لوگوں کو جوڑ دینا تمہارا کام نہ تھا بلکہ اس میں خود خدا کے مقلب القلوب کا ہاتھ کام کر رہا تھا

هُوَ الَّذِي اٰتٰكَ بَصْرًا وَّ اَلْمَوَدِّعَ۔ وہ ہی خدا ہے جس نے اپنی مودت اور مودتِ نبین کے ذریعہ آپ کی تائید
وَالْفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنفَقْتَ كِی۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں اسی نے باہمی الفت پیدا کی۔ اور
مافی الارض جمیعاً اَلْفَ۔ اگر آپ وہ سب کچھ خرچ کر دیتے جو زمین میں ہے تب بھی مسلمانوں
بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلْفَ۔ کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے۔ لیکن اللہ نے ان کو جوڑ دیا، بے شبہ
بَيْنَهُمَا اَنَّهُ عَزَّ وَجَلَّ۔ بڑی طاقت اور حکمت والا ہے۔

مرتب ایمانی کا تفاوت | عصیت جاہلیت کی ہلاکت آفرینی اور اسلام میں اسکی شدید مذمت کو معلوم کرنے کے بعد اب ذرا اس پر غور کیجئے کہ قطع نظر اس بحث سے جو ائمہِ محدثین نے الامایانِ یزید و فقیص کے باب میں کی ہے یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ ایمان جس اذعان کی کیفیت کا نام ہے اس میں اشتداد و ضعف دونوں کی استعداد ہوتی ہے

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح آج کل مسلمان مسلمان سب یکساں نہیں ہوتے۔ بلکہ مراتبِ ایمانی میں تفاوت ہوتے ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اس مرتبہ میں یکساں اور برابر کے درجہ کے نہیں تھے خود اپنی ذاتی استعداد اور فطری صلاحیت۔ اقتدارِ طبع۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ صحبت کی زیادتی اور کمی کے باعث ان برگزیدہ ہستیوں میں بھی باہمی فرق و امتیاز تھا۔

امیر معاویہؓ کی مثال | مثلاً حضرت معاویہؓ کو یہ لیجئے۔ ان کی شان میں کسی غیر صحابی کو گفتگو کرنے کی کیا مجال ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپؐ چونکہ فتح مکہ کے بعد اپنے والد ماجد ابوسفیان کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے آپؐ کو خلفاءِ اربعہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر رہنے اور براہِ راست آفتابِ نبوت و رسالت سے کسبِ فیض کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے ایک معزنا و رنما مورخانہان سے تعلق رکھنے کے باعث آپؐ میں جو عمدہ صفات تھیں مثلاً سیاسی تدبیر، انتقامت و استقلال اور شہامت و شجاعت اسلام قبول کرنے کے بعد ان پر اور جلا ہو گئی اور ان قوتوں کا مصرف بدل گیا۔ تاہم ہوا میں اور نبوہاشتم میں جو باہمی رقابت مدت سے چلی آ رہی تھی امیر معاویہؓ کو اس سے خالی الذہن نہیں کہا جاسکتا۔ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں انھوں نے جو کچھ کیا اس میں دوسرے عوامل و اسباب کی طرح اس رجحان کو بھی بڑا دخل ہے ممکن ہے کہ حضرت علیؓ پر بھی یہ شبہ کیا جائے لیکن یہ پھر بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت علیؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کو خاندانی رقابت کے زیر اثر اور اسلام کی تعلیمات یا اس کی روح کے خلاف کہا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ امیر معاویہؓ بہادری عالی حوصلگی و دیادلی اور سیاسی تدبیر کے لحاظ سے ہم عصروں میں ممتاز تھے لیکن جب انھوں نے اپنی ان قوتوں سے کفر کے مقابل میں کام لیا تو ایسے شاندار کارنامے کئے کہ مسلمانوں کی تاریخ کو ان پر ناز ہو سکتا ہے۔ لیکن جب ان کی یہی قوتیں اموی خاندان کی جڑیں مضبوط کرنے میں صرف ہوئی شروع ہوئیں تو اس سے ایک ایسے طریقِ حکومت کی تشکیل ہوئی جس کو خلافتِ راشدہ کی منہاج پر نہیں کہا جاسکتا۔ اور رسولِ صادق و امینؐ کی یہ پیشین گوئی کہ ”اے مسلمانو! نبوت کے بعد تم میں خلافت

علیٰ منہاج النبوت ہوگی اور جب تک خدا چاہے گا وہ ریگی، پھر اللہ تعالیٰ اس کو اٹھالے گا اور اس کے بعد ملک عاضہ (جابرانہ سلطنت) کا رواج ہوگا (مسند امام احمد بن حنبل) پوری ہوئی۔

عجمی مسلمانوں کے اثرات | (۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی فتوحات کے باعث عجمی قوموں کے جو لوگ مسلمان ہو کر عرب مسلمانوں کے ساتھ گھل ملکر رہنے لگے تھے وہ چونکہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور مسلمانوں کی اندرونی کشمکش کے باعث ان کو صحیح اسلامی تربیت کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا اس بنا پر اسلام کی حقیقی روح ان کے دل و دماغ میں سرایت نہیں کر سکی تھی اور عہد جاہلیت کے اطوار و طرق کا کچھ کچھ اثر اب بھی ان کی زندگیوں میں محسوس ہوتا تھا اور ہر سابیوں کا گروہ دیندار مسلمانوں کے بھیس میں برابر اپنی ذیل تنگ و دو میں مصروف تھا اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی اجتماعی وحدت کو مسموم کرنے کی کوشش کر رہا تھا اب یہ عیب صرف خدا کی ذات ہے اور انبیاء کرام کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہوتا ان دونوں طبقوں کے ساتھ میل جول کا یہ اثر ہوا کہ چند مواقع پر بڑے بڑے راسخ العقیدہ مسلمانوں سے بھی شدید بغضیں سرزد ہو گئیں اور وہ ان خطرات کا احساس نہیں کر سکے جو ان کے طرز عمل سے پیدا ہو سکتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس کا احساس پہلے سے تھا اس بنا پر وہ مختلف عامل و حکام کو وقتاً فوقتاً ایسی ہدایات دیتے رہتے تھے جن پر عمل پیرا ہونے سے اسلام اپنی مخصوص سادہ فطرت پر قائم رہے چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ”اے کاش ایران اور عرب کے درمیان آگ کی دیوار حائل ہوتی“

(۳) اکابر صحابہ کی گوشہ نشینی | ان وجوہ کی بنا پر مسلمانوں میں اختلاف و اشتقاق کا جو فتنہ برپا ہوا اس کو زیادہ ابھرنے اور پھیلنے کا موقع اس لئے بھی ملا کہ بعض اربابِ روح و اثر صحابہ کرام جو عہد نبوت اور اس کے بعد خلفاء ثلاثہ کے مبارک زمانوں میں علیٰ طور پر بڑے شاندار کارنامے انجام دیکھے تھے وہ ان ضرورت و فتن کو دیکھ کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ گویا پبلک زندگی سے انھوں نے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا اور اب میدان پر صرف ان لوگوں کا قبضہ تھا جو اپنے ہاتھ میں تئوڑی بہت طاقت رکھتے تھے چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی نسبت مشہور ہے کہ جب واقعہ حکیم میں انھوں نے جناب عمر بن العاص کا طرز عمل دیکھا تو انھیں اس کا اتنا شدید صدمہ اور رنج ہوا کہ وہ تمام سیاسی کاموں سے

کنارہ کش ہو کر ایک گاؤں میں جا بیٹے اور خانہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ حضرت عائشہ جنگِ جمل کے سلسلہ میں مدینہ سے بصرہ کے لئے روانہ ہونے لگیں تو اہل مدینہ کو اس کا اس درجہ سوچ ہوا کہ وہ زار و قطار روتے اور آہ و بکا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس دن کا نام ہی یوم النحیب (روزِ گریہ) پڑ گیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ ایک جلیل القدر صحابی تھے وہ ام المومنین کی اس دعوت پر شریک نہیں ہوئے اور انھوں نے الگ تھلگ رہنے کو ہی خیر سمجھا۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ حضرت عائشہؓ کے ہمراہ جانے کا قصد رکھتی تھیں، لیکن ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو سمجھایا۔ اور قسم دیکر انھیں بصرہ جانے سے روکا غرض یہ ہے کہ یہ حضرات اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اب اسلام میں فتنہ کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔ اس کا دردہ اپنے دل میں محسوس کرتے اور اس پر اشکباری کرتے تھے پھر زبان سے وعظ و نصیحت میں اور ارشاد و تلقین میں بھی انھوں نے کوئی فروگزاشت نہیں کی لیکن شکل یہ تھی کہ یہ وہ حضرات تھے جو اس وقت سیاسی طاقت نہیں رکھتے تھے مختلف ادارے اور عہدے دوسرے لوگوں کے قبضہ میں تھے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہی ہونا تھا کہ اربابِ خیر و تقویٰ کی آواز صدابہ صحرا یا نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی اور پھر وہ سب کچھ ہوا جو نہ ہونا چاہئے تھا۔

لمثل هذا اذ وب القلب من كذب ان كان في القلب سلام و ايمان

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے۔ یہ واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ امت کا زوال اس وقت شروع ہو گیا تھا لیکن پھر بھی ارشادِ نبوی کے مطابق یہ زمانہ خیر القرون تھا۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ اکابر صحابہ موجود تھے جنھوں نے ایک عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارکہ کا شرف حاصل کیا تھا اس وقت سیاسی اعتبار سے ان کا اثر خواہ کچھ زیادہ نمایاں نہ ہو لیکن وعظ و نصیحت۔ درس و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت کا چشمہ فیض ان بزرگوں کے نفوسِ قدسیہ کی بدولت برابر جاری تھا۔ اور اس کا اثر یہ تھا کہ انفرادی زندگی میں کسی کو ایجابِ منہیات و معصیات کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کسی گورنر یا حاکم سے کوئی ظالمانہ فعل سرزد ہوتا بھی تھا تو وہ اس کے لئے قرآن و حدیث سے ہی کوئی سندِ اعتدال تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ حضرات آپس میں کیسے ہی

لڑتے ہوں لیکن کفر کے مقابلے میں اپنے سب اختلافات بھول کر ایک ہو جاتے تھے۔ اس بنا پر اس وقت بھی ان کی ترقی اور فتوحات کا قدم رکنا نہیں، بلکہ وہ برابر آگے بڑھتے رہے اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ دینِ قیم کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

نبوایہ کا عہد | ۳۳۰ء میں خلافتِ راشدہ کے بعد امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر عجم بیعت ہوئی تو اس دن کی بنو امیہ کا عہد حکومت شروع ہوا۔ یہ عہد اپنے دامن میں امتِ مرحومہ کے عروج و زوال کی متعدد داستانیں رکھتا ہے۔ امیر معاویہ اس خاندان کے پہلے خلیفہ تھے۔ آپ کی خلافت ۳۵ء سے ۴۰ء تک یعنی تقریباً بیس سال رہی، جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے آپ کی خلافت نہ خلافتِ راشدہ تھی اور نہ آپ خلیفہ راشد تھے۔ لیکن اس کے باوجود حضورِ اہمّت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت اٹھائے ہوئے تھے۔ صحابی تھے اور کاتبِ وحی بھی تھے۔ اس لئے متعدد غلطیوں کے باوجود آپ کا دل خنیتِ ربانی اور اسلام کی ترقی و عروج کی حقیقی تڑپ کو خالی نہ تھا۔ چنانچہ طبری میں ہے کہ ایک مرتبہ شام کے کسی مقام پر پھیرے ہوئے تھے۔ سامنے سے آپ کے جاہ و حشم کا سامان گھوڑے، کنیز لکیں، اور گاڑیاں گزریں تو آپ انھیں دیکھ کر شرمسار ہو گئے اور ابنِ سعدؒ سے فرمانے لگے جو اس وقت آپ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ ابو بکرؓ پر رحم فرمائے نہ انھوں نے دنیا کو چاہا اور نہ دنیائے ان کا ارادہ کیا، عمرؓ کو دنیائے تو بہت چاہا مگر خود انھوں نے اس کا کبھی ارادہ نہیں فرمایا۔ یہ عثمانؓ تو ان کو دنیا سے کچھ ملا اور دنیائے ان سے بھی کچھ حاصل کیا۔ ان کے بعد ہم تو دنیا سے لست پت ہی ہو گئے۔

اس ذاتی خوبی کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ نے اس زمانہ کے نازک اور پچیدہ حالات میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو مضبوط اور محفوظ بنانے میں جس سیاسی تدبیر و راندیشی اور موقع شناسی کا ثبوت دیا ہے وہ آپ کے فضائل میں سرفہرست بننے کے لائق ہے۔

(باقی آئندہ)